© rasailojaraid.com

اس طرح میں خلق خدا کی گمراہی کا سبب بننے سے بچا لیا گیا ۔ میں نے یہ بات کبھی نہیں کہی، اور نہ ایسی بات کہنے کے لیے تیار ہوں کہ جن طبقوں میں زنانہ اور مردانہ سوسائٹی کے درمیان حد بندیاں کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں وہ سب اخلاقی پستی میں مبتلا ہیں، مگر اپنے مشاہدات کی بنا پر مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ ایسے طبقوں سے اخلاقی پستی قریب تر ہے اور ان کے اس میں مبتلا ہو جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ جہاں پولیس کا انتظام نہیں ہے وہاں سب چور اور ڈاکو ہی بستے ہیں، مگر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہاں چوری اور ڈاکے کا ارتکاب آسان تر ہے اور بدامنی پھیل جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ اجتماعی زندگی میں افراد کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا جتنی اہمیت رکھتا ہے، اتنی ہی اہمیت ایسے خارجی حدود و ضوابط کی بھی ہے جن سے افراد کو اخلاقی ذمہ داری کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنے سے محفوظ رکھا جا سکتا ہو۔ جو سوسائٹی اپنے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے ان دونوں تدبیروں میں سے محض کسی ایک ہی تدبیر پر اکتفا کرتی ہے وہ اپنے آپ کو ایک دائمی خطرے میں مبتلا رکھتی ہے۔

تاریخ بنی اسرائیل کے متعلق چند اشکالات

سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۹۵ پر آپ لکھتے ہیں: "پہلا جز یہ ہے کہ انسان کو بالعموم اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ دعوت عام ہونی چاہیے اور اس کے ساتھ دوسری غیر متعلق چیزوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیے ......" کیا دعوتِ توحید کے ساتھ رہائیِ بنی اسرائیل کا مطالبہ جو حضرت موسیٰ نے کیا غیر متعلق چیز نہ تھی؟

پھر آپ لکھتے ہیں: "دوسرا جز یہ ہے کہ جتھا ان لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان بوجھ کر اور سمجھ کر قبول کریں، جو بندگی و اطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں"۔ کیا سب بنی اسرائیل ایسے ہی تھے؟ کیا ان کے اعمال سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے؟ کیا فرعون کے غرق ہونے سے پہلے ان میں سے کسی

© rasailojaraid.com

نے بھی دینِ موسوی قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ حالانکہ کسی خاص سعی اور کشمکش کا پتہ قرآن پاک سے نہیں چلتا جس کی بنا پر بنی اسرائیل کے لکھوکھا آدمی تمام کے تمام مشرکانہ طاقتوں کے زیر دست رہنے کے باوجود ایک دم ایمان لے آئے ہوں۔ جو برتاؤ یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کے ساتھ کیا وہی برتاؤ حضرت موسیٰ کے ساتھ اس زمانہ کے کچھ بنی اسرائیل حکومت کی طاقت کو حرکت میں لاکر کر سکتے تھے۔ اور اگر ان میں کچھ کافر تھے تو وہ فرعون کے ساتھ غرق ہوئے یا نہیں؟ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ۔ یہ حضرت ہارونؑ کا مقولہ ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ حالانکہ حضرت مسیحؑ بنی اسرائیل ہی کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ میں تمہیں لڑانے آیا ہوں۔

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کا قصہ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ ابتدائی مکی سورتوں میں جو قرآن مجید کے آخری حصہ میں ملتی ہیں، یہ ذکر کیا جا چکا تھا کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کو خدا کی بندگی قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ مثلاً سورۂ نازعات میں ارشاد ہوا ہے اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى. فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى. وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى۔ اس میں۔ ہاں بنی اسرائیل کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ البتہ بعد کی مکی سورتوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ اس سے میں یہ سمجھا ہوں کہ منصب نبوت پر حضرت موسیٰ کے تقرر کے دو مقصد تھے۔ اوّل فرعون اور اس کی قوم کو اسلام کی طرف دعوت دینا، دوسرے اگر وہ اس دعوت کو قبول نہ کرے تو پھر اس مسلمان قوم کو، جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے مسلمان چلی آرہی تھی اور حضرت یوسفؑ کے بعد چار پانچ صدیوں کے دوران میں کسی وقت کفار سے مغلوب ہو کر رہ گئی تھی، کفار کے تسلط سے نکالنے کی کوشش کرنا۔ حضرت موسیٰ نے پہلے مقصد کی طرف پہلے دعوت دی اور دوسرے مقصد کو بعد میں لیا۔ دوسرے مقصد کو پہلے مقصد سے غیر متعلق سمجھنے کی کوئی وجہ مجھے نظر نہیں آتی۔

یہ سوال کہ کیا سب بنی اسرائیل نے دینِ موسوی قبول کر لیا تھا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کے خیال میں بنی اسرائیل غالباً کافر تھے، اور حضرت موسیٰ شاید پہلے شخص تھے جنھوں نے ان کو دینِ اسلام کی طرف دعوت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دی۔ حالانکہ فی الواقع صورت حال یہ نہ تھی۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے بنی اسرائیل میں مسلسل چار نبی آچکے تھے اور یہ لوگ اُن کی نسل سے تھے اور آخری نبی (حضرت یوسف) کو گذرے ہوئے چار پانچ سو برس سے زیادہ نہ گذرے تھے۔ حضرت موسیٰ کی آمد کے وقت بنی اسرائیل کی حالت کو اُس حالت پر قیاس کیجیے جو مثلاً امام غزالی کے زمانہ میں مسلمانوں کی تھی۔ وہ نہ تو کافر ہوگئے تھے، نہ ان کو کفر سے اسلام میں لانے کا کوئی سوال درپیش تھا اور نہ اُن میں موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا کوئی منکر تھا۔ البتہ ان کے اندر اتنا ضعف آگیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کی قیادت میں فرعون اور اس کی قوم کی طاقت سے تصادم کی جرأت کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے نوجوان تو حضرت موسیٰ کی قیادت میں اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے بڑی حد تک تیار ہوگئے تھے لیکن ان کے سن رسیدہ وجہاندیدہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ موسیٰؑ کا ساتھ دینے کے معنی اپنی دنیا کو تباہ کرلینے کے ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے اس حالت کا نقشہ بالکل صاف طور پر سامنے آجاتا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ اعراف۔ رکوع ۱۵۔ و سورہ یونس رکوع ۹) اس بات کا قرآن سے کہیں نشان نہیں ملتا کہ ان ضعیف الاعتقاد مسلمانوں میں سے کوئی عملاً فرعون کا ساتھ دے کر حضرت موسیٰ کی مخالفت کر رہا تھا، بلکہ قرآن اور توریت دونوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے مسلّمہ لیڈر بن گئے تھے۔ حتیٰ کہ جب وہ بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر چلے تو ایک اسرائیلی بھی پیچھے نہ رہا۔ حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں جس تنزل کو بنی اسرائیل پہنچے، اس پر بنی اسرائیل کو قیاس کرنا درست نہیں۔

حضرت ہارون نے جو کچھ حضرت موسیٰ سے کہا تھا، اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے اصل لیڈر اور ان کے جماعتی نظام کے ذمہ دار حضرت موسیٰ تھے اور حضرت ہارون ان کے مددگار کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں حضرت ہارون کسی غیر معمولی اہمیت رکھنے والے معاملے پر کوئی فیصلہ کن کارروائی کرتے ہوئے اس بنا پر ڈرتے تھے کہ کوئی ایسی بات ان سے نہ ہو جائے جو اصل ذمہ دار شخص کی پالیسی کے خلاف ہو۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ نے ان کی معذرت کو قبول کر لیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسیح علیہ السلام کا جو قول آپ نے نقل کیا ہے، وہ بالکل دوسرے حالات سے متعلق ہے۔ اس وقت کوئی اسلامی نظامِ جماعت یہودیوں میں موجود نہیں تھا کہ حضرت مسیح کے اس قول کو یہ معنی پہنائے جاسکیں کہ آپ اس نظامِ جماعت کو درہم برہم کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ بخلاف اس کے حضرت ہارون کے سامنے ایک مکمل اسلامی نظامِ جماعت موجود تھا اور وہ بجا طور پر اس امر میں احتیاط برت رہے تھے کہ کہیں ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جو اس نظامِ جماعت کو درہم برہم کر دے۔

قصۂ یوسفؑ میں دین الملک کا مفہوم

"مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ، میں "دین الملک" سے کیا مراد ہے؟"

اس سوال کا جواب میں اس سے پہلے ترجمان القرآن جلد ۲۱ کے عدد ۳، ۴، ۵، ۶ (مشترکہ) بابت ماہ رمضان، شوال، ذی القعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ میں تفصیل سے دے چکا ہوں۔ مختصراً یہ جان لیجیے کہ اس آیت میں دین الملک سے مراد بادشاہ کا قانون ہے جو مصر میں رائج تھا، اور مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ کے معنی یہ ہیں کہ "یوسف کا یہ کام نہ تھا کہ اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانون کے تحت گرفتار کرتا"۔ اس معنی کی بکثرت نظیریں قرآن میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو آیت مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلٰى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ (سورہ آل عمران - ۸) اسی بنا پر حضرت یوسف کے آدمیوں نے (غالباً خود حضرت ہی کی ہدایت کے مطابق) برادرانِ یوسفؑ سے دریافت کیا کہ چور کے متعلق تمہارے ہاں کا قانون کیا ہے۔ اور جو قانون انھوں نے بتایا اسی پر عمل کیا گیا، کیونکہ وہ شریعتِ ابراہیمی کا قانون تھا۔

حبشہ پر مسلمانوں کے حملہ آور نہ ہونے کی وجہ

"مصر کے مفتوح ہو جانے کے بعد، خلافت راشدہ کے زمانہ میں حبشہ کی جانب فتوحات کے لیے قدم کیوں

© rasailojaraid.com